چند قرآنی الفاظ کی لغوی تشریح

(۲)

(پہلی قسط دسمبر ۱۹۷۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی)

شیخ عنایت اللہ

آدم

آدم ایک عربی کلمہ ہے بمعنے ابو البشر ۔ قرآن مجید اور تورات کی رو سے آدم پہلا انسان ہے ، جسے خداوند کریم نے پیدا کیا ۔ اس کی خلقت کا قصہ تورات کی سفر التکوین اور قرآن پاک کی سورہ بقرہ میں آیا ہے ۔ آدم کا لفظ عربی کے علاوہ کنعانی (فنیقی) ، عبرانی اور سریانی زبانوں میں بھی موجود ہے ۔ گویا متعدد سامی زبانوں کا ایک مشترک کلمہ ہے ۔ جہاں تک تحریری شہادت کا تعلق ہے ، آدم کا لفظ سب سے پہلے تورات کی سفر التکوین (یعنی کتاب پیدائش) میں مذکور ہوا اور بعد ازاں قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں کم از کم پچیس مرتبہ آیا ہے ۔

ابوبکر جوالیقی نے اپنی کتاب ''المعرب'' میں آدم کے لفظ کو عربی بتایا ہے لیکن علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی نے اسے ایک عجمی کلمہ قرار دیا ہے ۔ راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں لفظ آدم کے اشتقاق کے بارے میں متعدد اقوال روایت کئے ہیں ، اور ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ آدم ''ادمۃ'' سے مشتق ہے ، جس کے معنی گندمی رنگت کے ہیں ۔ اگر اس قول کو قبول کر لیا جائے تو آدم کا وزن (احمر اور اسود کی طرح) افعل قرار پائے گا ۔

عربی میں آدم کا لفظ اسم علم کے طور پر صرف ابو البشر کے لئے استعمال

ہوا ہے ، لیکن عبرانی اور کنعانی زبانوں میں تمام انسانوں کے لئے بھی آیا ہے۔
آدم کا لفظ مغربی قوموں نے بھی اسم علم کے طور پر اختیار کیا ہے۔

الاحقاف

قرآن پاک کی رو سے '' الاحقاف '' جزیرۃ العرب کا وہ خطہ ہے جو قدیم زمانے میں قوم عاد کا مسکن تھا ۔ چنانچہ سورۃ الاحقاف میں ہے۔

واذکر اخا عاد اذ انذر قومه فی الاحقاف۔

(اور یاد کر عاد کے بھائی کو جب اس نے اپنی قوم کو احقاف کی سرزمین میں ڈرایا)

ذیل کی آیت کریمہ نے اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ عاد کے بھائی سے حضرت ہود ع مراد ہیں ، جو عاد کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے:

کذبت عاد المرسلین ۔ اذ قال لهم اخوهم هود الا تتقون ۔ انی لکم رسول امین۔ (سورۃ الشعراء)

(قوم عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا ، جب ان کے بھائی ہود نے ان سے کہا ۔ کیا تم پرہیزگاری اختیار نہیں کرو گے ۔ میں تمہاری طرف امانتدار پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں)

عربی زبان میں حقف کے معنی منحنی شکل کا رتیلا ٹیلا یا تودہ ہے ۔ احقاف اسی حقف کی جمع ہے ، اور اصطلاحی طور پر احقاف کا اطلاق اس ویران اور وسیع صحرا پر ہوتا ہے ، جو یمن کے مشرق میں کئی سو مربع میل میں پھیلا ہوا ہے ۔ اور سر بسر رتیلے ٹیلوں سے پٹا پڑا ہے ۔ چونکہ وہاں ریت کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا ۔ اس لئے عرب لوگ الاحقاف کو الرمل کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں ۔

اصحاب الاخدود

'' اصحاب الاخدود '' سے یمن کے وہ یہودی لوگ مراد ہیں جنہوں نے

یہودی حاکم ذو نواس کے عہد میں مذہبی تعصب کی بنا پر ''اخدود'' یعنی گڑھے کھود کر نجران کے عیسائیوں کو آگ میں جلا ڈالا تھا ۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تبع ابوکرب اسعد نے یہود مدینہ کے اثر سے پہلے خود یہودی مذہب اختیار کیا اور پھر اسے اہل یمن میں رائج کیا۔ ذو نواس اسی کے جانشینوں میں سے تھا ، جس نے نجران کے عیسائیوں کو جبراً یہودی بنانا چاہا اور جن لوگوں نے انکار کیا ، انہیں گڑھے کھود کر آگ میں جلا ڈالا ۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا ذکر سورۃ البروج میں ''اصحاب الاخدود'' کے نام سے آیا ہے :

قتل اصحاب الاخدود ۔ النار ذات الوقود ۔ اذ ھم علیھا قعود ۔ و ھم علی ما یفعلون بالمومنین شھود ۔

(ھلاک ھو جائیں خندقوں والے جو ایندھن سے آگ جلا رہے تھے، جب وہ ان خندقوں پر بیٹھے تھے اور جو کچھ سلوک وہ ایمانداروں سے کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے)

بیت ارخام کے اسقف شمعون نے اپنے ایک خط میں اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے جو ۵۲۳ ء میں پیش آیا تھا ۔ اس حادثہ سے برانگیختہ ھو کر قیصر روم نے اہل حبشہ کو یمن پر حملہ کرنے کے لئے ابھارا ۔ ذو نواس نے حبشہ والوں سے شکست کھائی اور ۵۲۵ ء میں بحر قلزم میں ڈوب کر مر گیا ۔ اس پر یمن کے حمیری خاندان کا خاتمہ ھو گیا اور ملک میں اہل حبشہ کی حکومت قائم ھو گئی ۔

نجران کا وہ مقام جہاں یہ حادثہ پیش آیا تھا اور خندقیں کھودی گئی تھیں ، اب تک مقامی عربوں کے ہاں ''اخدود'' کے نام سے مشہور چلا آرہا ہے ۔

الله

الله اهل اسلام کے هاں خدائے برحق کا مخصوص نام هے ، جو قرآن مجید میں ۲۵۰۰ مرتبه آیا هے۔

الله کا نام عربوں کے هاں ظہور اسلام سے پہلے بھی معروف تھا ، لیکن وہ الله کی عبادت میں کئی ایک دیوی دیوتاؤں کو بھی شریک کرتے تھے ، اسی لئے قرآن پاک نے ان کو مشرک کہا هے۔

لفظ الله کے اشتقاق اور اس کی ترکیب کے بارے میں بہت سے اقوال آئے هیں ، لیکن ان میں مقبول ترین قول یه هے که الله کا لفظ اله کی ابتداء میں لام تعریف بڑھانے سے بنا هے۔

بابل

بابل عراق کا ایک قدیم شہر هے جو دریائے فرات پر واقع تھا ، اور هاروت و ماروت کے ضمن میں قرآن پاک میں ایک مرتبه مذکور هوا هے ، چنانچه سورۂ بقره میں هے :

و اتبعوا ما تتلوا الشياطين على ملك سليمان و ما كفر سليمان و لكن الشياطين كفروا يعلمون الناس السحر و ما انزل على الملكين ببابل هاروت و ماروت

(بنو اسرائیل نے اس بات کی پیروی کی جو شیاطین نے سلیمان کی سلطنت کے بارے میں گھڑی تھی ، اور سلیمان نے کفر اختیار نہیں کیا ، بلکه شیاطین کافر ٹھہرے تھے ، جو لوگوں کو جادو سکھاتے تھے ، اور نیز وہ بھی جو بابل میں هاروت و ماروت پر اتارا گیا تھا)

بابل کا لفظ دو کلموں سے مرکب هے۔ باب اور ایل۔ باب کے معنے دروازے یا درگه کے هیں۔ اور ایل اله کی دوسری صورت هے۔ لہذا بابل کے معنے هوئے ''درگه الہی '' یا '' آستانه خداوندی ''۔

بابل کے لفظ سے ظاہر ہے کہ بابل والوں کی زبان السنہ سامیہ ہی کی ایک شاخ تھی، جو عربی اور عبرانی سے بہت کچھ مشابہت رکھتی ہے۔ اور یہ بات ان کتبوں سے بھی ثابت ہے جو مسماری خط (Cuneiform) میں ہیں اور بابل کے کھنڈروں سے کثیر تعداد میں ملے ہیں۔

بابل کی سلطنت کی ایک خاصی لمبی تاریخ ہے جس کو مورخین نے وہاں کے کتبات اور دیگر ذرائع سے مرتب کیا ہے۔ جب ایران کے بادشاہ کورش (Cyrus) نے سن ۵۳۸ قبل مسیح میں بابل کی مملکت کو تسخیر کیا تو یہ مملکت ایرانی سلطنت میں مدغم ہو کر زوال پذیر ہوگئی اور بابل کا شہر بھی آخرکار ویران ہوگیا، جس کے آثار گذشتہ صدی میں دریافت ہوئے ہیں۔

انگریزی میں بابل کو Babel لکھتے ہیں اور جس ملک یا مملکت کا وہ دار الحکومت تھا، اسے Babylonia کہتے ہیں۔

تورات

قرآن پاک کی رو سے تورات وہ الہامی کتاب ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے حضرت موسیٰ پر نازل کی تھی۔

تورات کا لفظ قرآن پاک میں اٹھارہ مرتبہ آیا ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدۃ میں ہے۔

انا انزلنا التوراته فیها هدی و نور یحکم بها النبیون الذین اسلموا للذین هادوا و الربانیون و الاحبار بما استحفظوا من کتاب الله و کانوا علیه شهداء

(ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ فرماں بردار پیغمبر اسی کے مطابق یہود کے مقدسات کا فیصلہ کرتے ہیں اور ان کے عالم اور فقیہ بھی جو اللہ کی کتاب کے نگہبان ہیں اور اس کے شاہد ہیں)

تورات ایک عبرانی لفظ ہے جس کے لغوی معنے شریعت یا قانون (Law) کے ہیں۔ انگریزی میں تورات کو Torah لکھتے ہیں۔

ہمارے بعض علماء نے تورات اور انجیل کو وری اور نجل سے مشتق بتایا ہے، لیکن علامہ زمخشری نے اس قول کو قبول نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''تورات اور انجیل دونوں عجمی لفظ ہیں۔ اور تکلف سے کام لے کر ان کو وری اور نجل سے مشتق بتانا اور ان کا وزن تفعلہ اور افعیل قرار دینا صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب یہ دونوں لفظ عربی ہوں''۔

حضرت موسیٰ کا زمانہ عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً پندرہ سو سال پیشتر کا ہے۔ اس دوران میں بنی اسرائیل پر بہت سے مصائب آئے، اور طاقتور ہمسایہ قوموں اور سلطنتوں نے ان پر کئی بار حملہ کیا اور ان کے ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ ان انقلابات میں تورات بھی کئی بار برباد ہوئی، لیکن بنی اسرائیل نے اسے ہر بار از سر نو مرتب کر لیا۔ علماء کا اندازہ ہے کہ تورات اپنی موجودہ صورت میں حضرت عیسیٰ سے تقریباً آٹھ سو سال پیشتر مرتب ہوئی تھی۔

جو تورات آج کل یہودیوں کے ہاں متداول ہے وہ ذیل کی پانچ کتابوں پر مشتمل ہے:

(۱) سفر التکوین (کتاب پیدائش) جس میں پیدائش عالم سے لے کر حضرت یعقوب ع اور حضرت یوسف ع کے زمانے تک کے حالات مذکور ہیں۔
(۲) کتاب الخروج جس میں حضرت موسیٰ ع کی ابتدائی زندگی اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے اور فرعون کے پنجۂ ستم سے نجات پانے کی کیفیت مندرج ہے۔
(۳) لاویین (۴) العدد (۵) اور التشنیہ میں حضرت موسیٰ ع کی بقیہ زندگی کے حالات اور ان کی لائی ہوئی شریعت کی تفصیلات ہیں۔

مذکورہ بالا پانچ کتابوں کو انگریزی میں Books of Moses کہتے ہیں

اور سورہ اعلیٰ میں جن ''صحف موسیٰ'' کا ذکر آیا ہے، ان سے شاید یہی کتابیں مراد ھیں - مغربی علماء کے ھاں ان کے لئے Pentatench کی اصطلاح بھی رائج ہے جس کے لفظی معنے ''کتب خمسہ'' ھیں -

جنۃ، الجنۃ

جن کے لغوی معنے کسی چیز کو پوشیدہ کرنے یا ڈھانپنے کے ھیں، اور باغ کو جنت غالباً اسی لئے کہتے ھیں کہ اس کے درخت زمین کو اپنے سایہ سے ڈھانپ لیتے ھیں - بہر حال جنت کا لفظ قرآن پاک میں باغ کے معنے میں کئی بار آیا ہے - چنانچہ سورہ سبا میں ہے :

لقد کان لسبا فی مسکنهم آیة جنتان عن یمین و شمال -

(سبا کی قوم کے لئے ان کے وطن میں ایک نشانی تھی ، یعنی دو باغ تھے، ایک دائیں طرف اور ایک بائیں طرف) -

جنت کی جمع جنات آتی ہے، اور جنات کا لفظ بھی قرآن پاک میں کئی مرتبہ آیا ہے، چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے :

و بشر الذین آمنوا و عملوا الصلحت ان لهم جنت تجری من تحتها الانهار -

(جو لوگ ایمان لائے ھیں اور انہوں نے نیک کام کئے ھیں، ان کو خوشخبری دو کہ ان کے لئے باغات ھیں، جن کے نیچے نہریں بہہ رھی ھیں)

لیکن جب جنة پر لام تعریف داخل ھو تو الجنة کا اطلاق اس بہشت بریں پر ھوتا ہے جو مومنوں کے لئے خداوند کریم کی طرف سے مخصوص ھو چکی ہے - چنانچہ سورۃ البراءۃ میں ہے :

ان اللہ اشتری من المومنین انفسهم و اموالهم بان لهم الجنة -

(بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کا مال خرید لیا ھے اس وعدے پر کہ ان کو اس کے بدلے میں جنت دی جائے گی)

الرحمان

رحمان کا لفظ رحم یا رحمة سے مشتق ھے اور اس کا وزن فعلان ھے اور جب اس پر لام تعریف داخل ہو تو خداوند کریم کی ذات کے لئے مخصوص ہو جاتا ھے اور وہ اللہ کا ہم معنی اور مترادف بن جاتا ھے۔ جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل کی ذیل کی آیت سے ظاہر ھے:

قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمن ایا ما تدعوا فلہ الاسماء الحسنی۔

(اے نبی کریم، لوگوں سے کہدو کہ خواہ تم اللہ کو پکارو یا الرحمن کو پکارو، جس نام سے بھی تم پکارو، اس کے سبھی اچھے نام ھیں)

الرحمان کا نام جنوبی عرب کے ساتھ مخصوص تھا، چنانچہ سد مارب کا قدیم کتبہ بنعمة الرحمن الرحیم کے الفاظ سے شروع ھوتا ھے۔ جب اسلام نے ابتداءً رحمان کا نام لیا تو مکہ کے قریش کو اجنبی معلوم ھوا۔ صحیح بخاری میں لکھا ھے کہ جب صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت علی رض نے عہد نامہ کی پیشانی پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا تو قریش کا نمائندہ معترض ھوا اور کہا کہ ہم رحمان کو نہیں جانتے کہ کون ھے۔ قرآن پاک میں قریش کے اس تعجب آمیز انکار کی تصریح یوں آئی ھے:

واذا قیل لهم اسجدوا للرحمن قالوا و ما الرحمن أنسجد لما تامرنا و زاد هم نفورا۔

(اور جب ان سے کہا گیا کہ رحمان کو سجدہ کرو تو وہ بولے کہ رحمان کیا ھے۔ کیا تو جس کو کہے گا ہم اسی کو سجدہ کریں گے اور اس بات سے ان کی نفرت اور بڑھ گئی)

قرآن مجید کی ہر سورت کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوتا ہے اور مفسرین نے رحمان اور رحیم کو ہم معنی صفتیں سمجھ کر ان کی متعدد تاویلیں کی ہیں، لیکن قرآن پاک کے انداز بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے رحمان کو بطور صفت نہیں بلکہ اسم علم کے طور پر استعمال کیا ہے اور وہ اللہ کا ہم معنی اور مترادف ہے، بلکہ اسی کا دوسرا نام ہے۔

زبور

از روے قرآن مجید زبور وہ الہامی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے داؤد ع پر نازل کی تھی۔ قرآن پاک میں زبور کا ذکر حضرت داؤد ع کے تعلق سے تین بار آیا ہے، سورہ بنی اسرائیل میں ہے:

و آتینا داؤد زبورا ہ یعنی ہم نے داؤد ع کو زبور دی، اور یہی الفاظ سورۃ النساء میں بھی آئے ہیں۔

اس کے علاوہ سورۃ الانبیاء میں بھی زبور سے ایک اقتباس منقول ہے:

و لقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون۔

(اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھا ہے کہ بے شک زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے)

جیسا کہ جوہری نے صحاح میں لکھا ہے، زبر کے معنے کتابت یعنی لکھنے کے ہیں، اور زبر (کسرہ کے ساتھ) کتاب کو کہتے ہیں، جس کی جمع زبور آتی ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ زبور زبر (فتحہ کے ساتھ) سے مشتق ہے اور وہ فعول کے وزن پر ہے اور مفعول کے معنے میں آیا ہے۔

قرآن پاک میں جمع کا صیغہ زبر (ضمہ کے ساتھ) چند بار الہامی کتابوں کے معنے میں آیا ہے اور ان آسمانی نوشتوں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے جن میں

انسانی اعمال لکھے جاتے ہیں، لیکن اصطلاحی طور پر زبور سے مراد وہ الہامی کتاب ہے جو داؤد ع پر نازل ہوئی تھی۔

حضرت داؤد ع نے اورشلیم کو اپنا دار الحکوست بنایا اور اس کے قریب صہیون (Zion) کی پہاڑی پر ایک عالی شان خیمہ نصب کیا جہاں قربانی دی جاتی تھی اور اللہ کی عبادت کی جاتی تھی۔ انہوں نے اس معبد میں خدا کی حمد و ثناء کہنے کے لئےسینکڑوں آدمی مقرر کئے۔ حضرت داؤدع خود بھی خوش گلو تھے اور خدا کی تعریف میں ترانے گاتے تھے، اسی لئے آج تک لحن داؤدی ضرب المثل ہے۔

آج کل یہود کے مقدس مذہبی نوشتوں میں داؤد ع کے ترانے بھی شامل ہیں، جن میں خدائے تعالی کی حمد و ثناء کی گئی ہے۔ ان کو عبرانی میں مزامیر داؤد اور انگریزی میں (Psalms of David) کہتے ہیں ان مزامیر کی تعداد ایک سو پچاس ہے۔

سجیل

سجیل کے معنے ہیں کنکر یا مٹی کا ڈھیلا جو منجمد ہو کر پتھر کی طرح سخت ہو جائے۔

سجیل کا لفظ قرآن مجید میں تین مرتبہ استعمال ہوا ہے سورہ ہود میں ہے۔
و امطرنا علیھا حجارۃ من سجیل۔

(اور ہم نے اس بستی پر کنکر کے پتھر برسائے) یہی الفاظ سورۃ الحجر کی ایک آیت میں آئے ہیں۔

سورۃ الفیل میں بھی سجیل کا لفظ اسی طرز پر استعمال ہوا ہے
و ترمیھم بحجارۃ من سجیل۔

(اور ابابیل ان پر یعنی اصحاب الفیل پر کنکر کے پتھر برسا رہی تھیں)
سورۃ الذریت میں جہاں گذشتہ انبیاء کا ذکر آیا ہے وہاں ایک آیت میں

کہا گیا ہے : لنرسل علیهم حجارة من طین ہ (یعنی) ہم ان پر مٹی کے پتھر برسائیں گے (آیت ۳۳) اس آیت میں حجارہ کے ساتھ طین یعنی مٹی کا جو ذکر آیا ہے اس سے بھی ''حجارة من سجیل'' کے مفہوم پر بڑی مفید روشنی پڑتی ہے۔

علماء لغت اور اکثر مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ اپنی اصل کے لحاظ سے سجیل ایک عجمی کلمہ ہے اور ''سنگ گل'' کا معرب ہے۔ سنگ کے معنے پتھر اور گل کے معنے مٹی ہیں۔ چنانچہ ابن قتیبہ ، جوالیقی ، راغب اصفہانی اور قاضی خفاجی اور مفسرین میں سے قاضی بیضاوی اور امام سیوطی کی یہی رائے ہے کہ سجیل ایک فارسی لفظ کا معرب ہے۔ مجاہد بھی اس بات کے قائل تھے کہ سجیل کا لفظ فارسی الاصل ہے۔ چنانچہ امام سیوطی نے اتقان میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''سجیل بالفارسیة اولها حجارة و آخرها طین''۔

سکین

سکین کا لفظ قرآن پاک میں چھری کے معنے میں آیا ہے ، اور صرف ایک مرتبہ آیا ہے۔ سورہ یوسف میں ہے :

و اتت کل واحدة منهن سکیناً ۔ (اس نے یعنی یوسف ع کی مالکہ نے ان (مہمان) عورتوں میں سے ہر ایک کو ایک چھری دی)

امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں کہ السکین سمی لازالته حرکة المذبوح ، یعنی چھری کو سکین اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ مذبوح کی حرکت کو خاموش کر دیتی ہے۔ امام موصوف نے سکین کی جو توجیہ فرمائی ہے وہ محض خیالی اور قیاسی ہے ، جس کی تائید کسی دوسری شہادت یا روایت سے نہیں ہوتی ۔

ابو منصور جوالیقی ، امام سیوطی اور قاضی خفاجی نے سکین کو معربات

میں شمار نہیں کیا - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی یہ لفظ خالص عربی ہے۔

لیکن مغربی علماء کی یہ رائے ہے کہ سکین کا لفظ آرامی ہے، جو عربی میں باہر سے آکر داخل ہوا ہے ، اور اس خیال کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ جن ایام میں ہادی انام علیہ الصلوۃ و السلام مدینہ منورہ میں تشریف فرما تھے، ایک دن آپ ؐ نے انصار سے فرمایا '' ائتنی السکینة '' یعنی مجھے ایک سکین دو۔ لیکن حاضرین میں سے کسی نے رسول مقبول کی بات نہ سمجھی۔ آخرکار جب آنحضرت نے اپنا مطلب سمجھایا ، تو انصار بولے کہ اچھا آپ ؐ کو مدیہ درکار ہے ! اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ عہد رسالت میں سکین کا لفظ مدینہ میں معروف نہ تھا اور وہاں کے لوگ چھری کو مدیہ کہتے تھے۔ عہد نبوی میں شام اور فلسطین کے ملکوں میں آرامی عوامی زبان کی حیثیت سے رائج تھی ، اس لئے یہ بات عین قرین قیاس ہے ، کہ قریش کے تجارتی روابط سے سکین کا لفظ مکہ میں رائج ہوگیا ہو اور حجاز کے باقی حصے اس سے نامانوس رہے ہوں۔ اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جس طرح یہ لفظ قرآن پاک میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے ، اسی طرح راوی حدیث کا بیان ہے کہ یہ لفظ صرف اسی ایک حدیث میں پایا گیا ہے۔

صحیفہ ، صحف

صحیفہ کا لفظ '' صحف '' سے مشتق ہے جس کے معنے لکھنے یا تحریر کرنے کے ہیں۔ حبشی اور حمیری زبانوں میں بھی صحف کے یہی معنے ہیں۔

صحیفہ کا مفہوم مفعولی ہے کیونکہ اس سے وہ تحریر یا کتاب مراد ہے جو لکھی جائے اور معرض تحریر میں لائی جائے۔

صحیفہ کا لفظ بصورت مفرد قرآن مجید میں کہیں استعمال نہیں ہوا ، لیکن اس کی جمع صحف (ضمہ کے ساتھ) کلام پاک کی متعدد سورتوں میں آٹھ مرتبہ

آئی ہے اور ہر موقع پر صحف سے قدیم انبیاء کی الہامی کتابیں مراد ہیں، چنانچہ سورۃ الاعلیٰ میں صحف ابراہیم و موسیٰ کا ذکر آیا ہے،

ان ہذا لفی الصحف الاولی صحف ابراہیم و موسیٰ ۔

(بےشک یہ بات پہلے صحیفوں میں بھی آچکی ہے، یعنی ابراہیم ع اور موسیٰ ع کی کتابوں میں)

اس کے علاوہ سورہ البینہ میں ہے:

رسول من اللہ یتلو صحفاً مطہرۃ فیہا کتب قیمۃ ۔

(اللہ کا رسول پاکیزہ صحیفے پڑھتا ہے، جن میں مضبوط آیات لکھی ہوئی ہیں) ۔ اس آیت کریمہ سے ظاہر ہے کہ عہد رسالت ہی میں وحی آسمانی صحیفوں کی صورت میں موجود تھی (اور اس کے لکھنے والے وہ صحابہ کرام تھے جو تاریخ اسلام میں "کاتبان وحی" کے معزز لقب سے مشہور ہیں)

حضرت ابوبکر صدیق رض کے عہد خلافت میں قرآن پاک جمع ہوا تھا لیکن وہ الگ الگ صحیفوں میں تھا، جن کی صورت غالباً طوامیر (Scrolls) کی تھی۔ حضرت عثمان غنی رض نے اپنے عہد خلافت میں ان صحیفوں کو نقل کرا کے یکجا کر دیا اور اس مجموعہ کا نام "مصحف" ٹھہرا، کیونکہ اس میں بہت سے صحیفوں کو ایک ہی جلد میں جمع کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ جوہری نے صحاح میں مصحف کی تشریح میں لکھا ہے:

"المصحف بضم المیم و کسرھا و اصلہ الضم لانہ ماخوذ من اصحف ای جمعت فیہ الصحف"۔

(مصحف میم کے ضمہ کے ساتھ ہے اور اس میں کسرہ بھی آیا ہے، لیکن اصل میں ضمہ ہے کیونکہ وہ اصحف سے ماخوذ ہے یعنی اس میں صحیفوں کو جمع کر دیا گیا ہے)

حبشی زبان میں مصحف کا لفظ کتاب کے معنے میں بہت عام ہے، اس لئے بعض مغربی علماء کا خیال ہے کہ مصحف کا لفظ عربی مین حبشی زبان سے مستعار لیا گیا ہے۔

طور

طور کے لغوی معنے محض پہاڑ کے ہیں، لیکن جب اس پر لام تعریف کا داخل ہو تو اس سے مراد وہ خاص پہاڑ لیتے ہین جس کا تعلق حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے ہے اور جو سینا کے علاقہ میں واقع ہے، اور جہاں حضرت موسیٰ ع کو ان کی شریعت عطاء ہوئی تھی۔

صحیح البخاری میں مجاھد کا یہ قول منقول ہے کہ ان الطور اسم سریانی بمعنی الجبل یعنی طور ایک سریانی لفظ ہے جس کے معنے پہاڑ ہیں۔ اور امام سیوطی نے بھی اتقان میں لکھا ہے:

" انہ اسم نبطی بمعنی الجبل لکن القرآن اطلقہ علی جبل مخصوص "

یعنی طور ایک نبطی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی پہاڑ کے ہیں لیکن قرآن نے اس کا اطلاق ایک خاص پہاڑ پر کیا ہے۔ یاقوت رومی نے بھی معجم البلدان میں یہی لکھا ہے کہ بلسان النبط کل جبل یقال لہ الطور یعنی نبطیوں کی زبان میں ہر ایک پہاڑ کو طور کہتے ہیں۔

حضرت موسیٰ ع اور بنی اسرائیل کے ضمن میں طور کا ذکر قرآن پاک میں کئی مرتبہ آیا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ ع کو نہ صرف وہاں شریعت عطاء ہوئی تھی بلکہ خدائے تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے میثاق بھی وہیں لیا تھا۔ چنانچہ سورہ مریم میں ہے:

و نادیناہ من جانب الطور الایمن۔

(یعنی ہم نے اسے (یعنی موسیٰ کو) پکارا طور کی دائیں جانب سے)

پھر سورۂ بقرہ میں ہے:

و اذ اخذنا میثاقکم و رفعنا فوقکم الطور

(اور جب ہم نے تم سے عہد و پیمان لیا اور تمہارے اوپر طور کو کھڑا کر دیا)

طور سینا اور طور سینین کا ذکر سورہ المومنون اور سورہ التین میں بھی آیا ہے لیکن ان سورتوں میں طور کا ذکر بنی اسرائیل کے تعلق سے نہیں ہے۔ سورہ المومنون میں ہے :

و شجرۃ تخرج من طور سینا تنبت بالدھن و صبغ للاکلین

(ایک درخت ہے جو سینا کے پہاڑ میں اگتا ہے ، اس سے زیتون کا تیل پیدا ہوتا ہے جو کھانے والوں کے کام بھی آتا ہے)

پھر سورہ التین میں ہے :

و التین و الزیتون ۔ و طور سینین ۔ و ھذا البلد الامین ۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ۔ ثم رددناہ اسفل سافلین ۔

(اور قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور سینا کے پہاڑ کی اور اس پرامن شہر کی ، ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا اور پھر اسے پست ترین جگہ میں گرا دیا)

ان سورتوں میں طور سینا اور طور سینین دونوں مرکب اضافی ہیں اور ان سے مراد وہ پہاڑ ہے جو سینا کی سر زمین میں واقع ہے ، یعنی پہاڑ کا نام اس علاقہ پر مبنی ہے جو اس کا محل و قوع ہے۔

سینا (جس کو انگریزی میں Sinai لکھتے ہیں) ایک خاصا بڑا مثلث شکل کا جزیرہ نما ہے ، جس کے مشرق میں فلسطین اور بلاد عرب ، شمال میں بحیرہ روم ہے اور مغرب میں مصر کا ملک اس کی حد بندی کرتا ہے اور اس کے جنوب میں بحر قلزم واقع ہے۔

عرم

عرم کا لفظ صرف ایک مرتبہ قرآن پاک میں جنوبی عرب کی قوم سبا کے ذکر میں آیا ہے۔

فاعرضوا فارسلنا علیھم سیل العرم۔

(انھوں نے روگردانی کی پس ھم نے ان پر بند کا سیلاب بھیجا یعنی وہ سیلاب جو بند کے ٹوٹنے سے آیا تھا)

ابن درید (متوفی سن ۳۲۱ ھ) نے اپنے جمھرۃ اللغہ میں عرم کی تشریح میں صاف لکھا ہے کہ العرمۃ سد یعترض الوادی یحتبس الماء یعنی عرمہ کے معنے بند ھیں جو وادی کے عرض میں پانی روکنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔

جوھری (متوفی سن ۳۹۳ ھ) نے صحاح میں التھذیب سے یہ قول نقل کیا ہے کہ عرم سے ایسا سیلاب مراد ہے جو بے پناہ ھو۔ اور ایک یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ عرم عرمہ کی جمع ہے جس کے معنے بند کے ھیں اور یہی قول صحیح اور برمحل ہے۔

امام راغب اصفھانی (متوفی سن ۵۰۲ ھ) مفردات القرآن میں عرم کی تشریح میں لکھتے ھیں کہ "قولہ سیل العرم اراد سیل الامر العرم و قیل العرم المسناۃ و قیل العرم الجرز الذکر و نسب الیہ السیل من حیث انہ نقب المسناۃ یعنی سیل العرم سے یہ مراد ہے کہ ھم نے ان پر سخت سیلاب بھیجا اور ایک قول یہ ہے کہ عرم کے معنے سد یا بند کے ھیں اور ایک قول یہ ہے کہ عرم سے مراد چوھا ہے اور سیلاب اس کی طرف اس لئے منسوب ھوا کہ اس نے بند میں سوراخ کیا تھا"۔

علامہ زمخشری (م سن ۵۳۸ ھ) نے آیت بالا کی تفسیر میں عرم کے معنے چوھا بتایا ہے، یعنی امام راغب کے دئے ھوئے اقوال میں سے وہ قول اختیار کیا ہے جو محض خیالی اور قیاسی ہے اور سب سے زیادہ ضعیف ہے۔

اس بارے میں مضبوط قول وہ ہے جسے نشوان الحمیری (متوفی سن ۵۷۳ ھ) نے اپنی تالیف شمس العلوم میں بیان کیا ہے کہ عرم در اصل حمیری زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنے سد یا بند کے ھیں جو کسی وادی میں پانی روکنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔ اس قول کی تصدیق اس امر سے ھوتی ہے کہ عرم کا لفظ ان کتبوں میں بھی پایا گیا ہے، جو یمن کے قدیم آثار پر منقوش پائے گئے ھیں۔

صاحب قاموس (متوفی سن ۸۱۷ ھ) نے سیل العرم کی تشریح میں عرم کے چار پانچ معانی لکھے ھیں اور ان میں سے ایک معنیٰ یہ بتایا ہے کہ عرم سے مراد وہ بند ھیں جو وادیوں میں بنائے جاتے ھیں اور یہی معنے مذکورہ بالا آیت کے لئے موزوں ھیں۔

قرآن پاک کے اردو اور انگریزی تراجم میں عرم کے مفہوم کے بارے میں جو پریشان خیالی پائی جاتی ہے، اس کی یہی وجہ ہے کہ لغت نویسوں اور مفسروں نے عرم کے کئی مختلف معانی دئے ھیں اور مترجم یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ ان میں سے کس کو ترجیح دیکر اختیار کریں۔

عربی زبان میں بند (Dam) کے لئے متعدد الفاظ آئے ھیں، مثلاً سد، سکر اور مسناۃ لیکن قرآن حکیم نے جنوبی عرب کے قدیم تاریخی واقعات کے بیان میں ایک ایسا لفظ استعمال کیا ہے جو وھاں کی زبان کے ساتھ مخصوص ہے، اور یہ بات کلام پاک کے انداز بلاغت میں داخل ہے۔

نوٹ: یہ مضمون حذف و اضافہ اور ترتیب کی جزئی تبدیلی کے ساتھ بعض دوسرے پرچوں میں پہلے ھی شائع ھو چکا ہے۔ اس کا علم اس وقت ھوا جب فکر و نظر کے لیے یہ مضمون کمپوز ھو کر طباعت کے مرحلے میں تھا۔ مضمون نگار حضرات سے التماس ہے کہ فکر و نظر کو ایسا کوئی مضمون نہ بھیجیں جو کسی اور پرچے کو بھی بھیجا گیا ھو۔ (ادارہ)